بدعت

ہمارے ہاں عام طور پر ایک خاص نقطہ نظر رکھنے والے طبقے کی طرف سے شرک اور بدعت کی دو اصطلاحات کو بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے، بغیر سوچے سمجھے ہر قسم کے امور پر لفظ شرک اور بدعت کو چسپاں کرکے اُمت کی بھاری اکثریت کو مشرک، بدعتی اور گمراہ قرار دے دیا جاتا ہے اور وہ آیات اور احادیث مبارکہ جو کفار و مشرکین کے بارے میں نازل ہوئیں انہیں بڑی بے باکی سے امت مسلمہ پر چسپاں کر دیا جاتا ہے جو کہ ایک نہایت غلط طرز عمل ہے۔اس مضمون میں بدعت کے حوالے سے پائے جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے۔

بدعت کا مفہوم

لفظ بدعت کے معنی ہیں نیا کام، اس لیے لُغت کے اعتبار سے ہر نئے کام کو اچھا ہو یا بُرا بدعت کہہ دیا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ علماء نے اس ابہام سے بچنے کے لیے بدعت کی تقسیم کی ہے اور اسے بدعت حسنہ (یعنی اچھی بدعت) اور بدعت سیئہ (یعنی وہ بدعت جو گناہ ہے) میں تقسیم کیا ہے اور صرف بدعت سیئہ کو ہی حرام قرار دیا ہے۔اس تقسیم کو بیان کرنے والوں میں امام شافعیؒ (وفات 204 ہجری) ،امام قرطبیؒ (وفات 380 ہجری)، امام بیہقیؒ (وفات 458 ہجری)، امام غزالیؒ (وفات 505 ہجری)، امام نوویؒ (وفات 676 ہجری)، ابن تیمیہؒ (وفات 728 ہجری)، ابن کثیرؒ (وفات 774 ہجری)، ابن رجب حنبلیؒ (وفات 795 ہجری)، علامہ شوکانیؒ (وفات 1255 ہجری) اور علامہ بھوپالیؒ (1307 ہجری) وغیرہ شامل ہیں۔

علامہ ابن تیمیہؒ بدعت کی تعریف کرتے ہوئے "مجموع الفتاویٰ" میں لکھتے ہیں کہ بدعت (یعنی بدعت سیئہ) سے مراد ایسا کام ہے جو کتاب و سنت اور اُمت کے نیک افراد کے اجماع کی مخالفت کرے، جیسے خوارج، روافض، قدریہ اور جہمیہ کے عقائد۔امام ابن تیمیہؒ اپنی کتاب منہاج السنة میں حضرت عمر فاروقؓ کی جانب سے نماز تراویح کو باجماعت ادا کرنے کے اہتمام کو بدعت حسنہ (بدعت لغوی) قرار دیتے ہیں۔[1]

اسی طرح ابن کثیرؒ بھی اپنی تفسیر میں بدعت کی تقسیم بیان کرتے ہوئے نماز تراویح کی جماعت کو بدعت حسنہ (بدعت لغوی) قرار دیتے ہیں[2]۔امام غزالیؒ کے نزدیک بھی ہر بدعت ممنوع نہیں ہوتی بلکہ ممنوع صرف وہ بدعت ہوتی ہے جو سنت سے متضاد ہو[3]۔امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ بنیادی طور پر بدعت کی دو اقسام ہیں۔وہ لکھتے ہیں شریعت میں بدعت سے مراد وہ نئے امور ہیں جو حضور نبی اکرم

---

[1] ابن تیمیہؒ، منہاج السنہ، ۴:۲۲۴
[2] ابن کثیرؒ، تفسیر القرآن العظیم، ۱:۱۶۱
[3] غزالیؒ، احیا العلوم، ۲:۳

ﷺ کے زمانے میں نہ تھے اور یہ بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ (بدعت قبیحہ) میں تقسیم ہوتے ہیں۔[4]

بدعت کی اقسام

بدعت حسنہ

اگر کوئی عمل نہ قرآن میں ذکر ہو نہ ہی رسول ﷺ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہو اور بعد اذاں امت کے صالحین اور علماء از خود کسی نئے عمل کو وقت کی ضرورت سمجھ کر اپنالیں اور اس کا مقصد اللہ تعالی کی رضا کا حصول ہو تو انما الاعمال باالنیات کے تحت یہ بدعت مقبول اور باعث اجر و ثواب ہو گی اسی کو بدعت حسنہ کہتے ہیں۔[5]

رہبانیت کی بدعت: سورہ الحدید میں اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے متعلق اذن الٰہی کے بغیر کسی بدعت کو ایجاد کرنے اور اس کی مقبولیت اور اس پر اجر و ثواب کے حوالے سے ارشاد فرمایا کہ: "ہم نے اُن کے پیچھے عیسیٰؑ ابن مریمؑ کو بھیجا اور ہم نے انہیں انجیل عطا کی اور ہم نے اُن لوگوں کے دلوں میں جو اُن کی پیروی کر رہے تھے شفقت اور رحمت پیدا کر دی اور رہبانیت (یعنی عبادت الٰہی کے لیے دنیا کو ترک کرنا) کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کر لی تھی۔ اُسے ہم نے اُن پر فرض نہیں کیا تھا مگر (انہوں نے رہبانیت کی یہ بدعت) محض اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے شروع کی تھی۔ پھر اُس کی عملی نگہداشت کا جو حق تھا وہ اس کی ویسی نگہداشت نہ کر سکے (یعنی اُسے اُسی جذبے اور پابندی سے جاری نہ رکھ سکے) لہذا ہم نے اُن لوگوں کو جو اُن میں سے ایمان لائے (اور رہبانیت کی بدعت کو رضائے الٰہی کے لیے جاری رکھے ہوئے تھے) اجر و ثواب عطا کیا۔"[6]

غور طلب بات یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ: "اسلام میں رہبانیت نہیں ہے"[7]۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پہلی شریعت میں رہبانیت موجود تھی۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ پہلی شریعت میں رہبانیت کہاں سے آئی جبکہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ میں نے تو اُسے کسی شریعت میں نازل نہیں کیا۔ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ ہر وہ حکم جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کی طرف سے نہ ہو اور اُس کی ممانعت پر کوئی حکم بھی نہ ہو تو وہ نیک مقصد اور نیک نیتی کی وجہ سے مستحسن اُمور (ایسے اچھے اور پسندیدہ کام جو دین میں اخلاقی اور پسندیدہ سمجھے جاتے ہیں، مگر لازم یا واجب نہیں ہوتے) میں داخل ہو گیا اور اُسے شریعت میں جگہ مل گئی۔ اسی طرح رہبانیت بھی اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہونے کے باوجود بدعت حسنہ ہونے کی وجہ سے شریعت میں داخل ہو گئی اور اس کام کا کرنا باعث اجر و ثواب بن گیا۔

خیر کے کاموں کی ترغیب: امام مسلم (وفات 261 ہجری) کتاب الزکوۃ میں روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے خیر کے کاموں اور امور حسنہ کے اجرا کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: "جس شخص نے اسلام میں کسی نیک کام کی ابتدا کی اُس کو اپنے عمل کا بھی

---

[4] نوویؒ، شرح صحیح مسلم، ۱:۲۸۶

[5] بخاری، الصحیح، ۱:۲۷۲، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ، رقم: ۱:::ابوداود، السنن، ۲:۲۷۲:::ابن ماجہ، السنن، ۲:۱۴۱۳

[6] القرآن، الحدید، ۵۷:۲۷

[7] ابن حجر عسقلانیؒ، فتح الباری، ۹:۱۱۱:::سیوطی، شرح سنن ابن ماجہ، ۱:۲۸۹، رقم: ۴۰۱۰

اجر ملے گا اور بعد میں عمل کرنے والوں کے عمل کا بھی اجر ملے گا اور ان عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہو گی اور جس نے اسلام میں کسی بُرے عمل کی ابتدا کی اُسے اپنے عمل کا بھی گناہ ہو گا اور بعد میں عمل کرنے والوں کے عمل کا بھی گناہ ہو گا اور اُن عمل کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔"[8]

معاذؓ نے تمہارے لیے یہ اچھا طریقہ نکالا ہے تم بھی اب یوں ہی کیا کرو: آغاز اسلام میں یہ دستور تھا کہ اگر حضور ﷺ نماز کی امامت کرا رہے ہوتے اور دوران نماز کوئی آجاتا تو وہ دوسرے صحابی سے پوچھ کر کہ کتنی رکعتیں ہو چکی ہیں اتنی رکعتیں پہلے پڑھ کر پھر حضور ﷺ کے ساتھ جماعت میں مل جاتا۔ ایک دن حضرت معاذؓ آئے اور کہنے لگے میں تو حضور ﷺ کو (دوران نماز) جس حال میں پاؤں گا اسی میں مل جاؤں گا اور جو نماز چھوٹ گئی ہے اسے حضور ﷺ کے سلام پھیرنے کے بعد ادا کر لوں گا[9]۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے ایسا ہی کیا اور حضور ﷺ کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی باقی رکعتیں ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے اُنہیں دیکھ کر فرمایا کہ: "معاذؓ نے تمہارے لیے یہ اچھا طریقہ نکالا ہے تم بھی اب یوں ہی کیا کرو۔"[10]

اس مقام پر غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے اپنی رائے اور اجتہاد سے اس طریقے کو ترک کیا جس پر تمام صحابہ عمل پیرا تھے۔ لیکن چونکہ حضرت معاذؓ کا عمل مبنی بر خلوص اور ادب تھا لہذا حضور اکرم ﷺ نے اُن کے اس عمل کو پسند کیا اور اس کی تحسین فرماتے ہوئے صحابہ کو اس نئے عمل کو اپنانے کا حکم دیا۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ سنت رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں صحابہ کرامؓ چھوٹے چھوٹے خیر کے کاموں اور نیک اعمال کو محض نیا ہونے کی وجہ سے رد کرنے کی بجائے "من سن فی الاسلام سنة حسنة"[11] (ترجمہ: جس نے اسلام میں کوئی اچھی روایت شروع کی) کے تحت دین میں جگہ دیتے تھے۔ صحابہ کی اس روش سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر وہ کام جو مصلحت اور حکمت پر مبنی ہو اور احکام شریعت سے متصادم نہ ہو وہ بلا شک و شبہ مباح اور جائز ہے۔

بدعت سیئہ

ارشاد نبوی ہے کہ: **"وہ نیا کام (احداث) مردود ہو گا جو اس دین میں اصلا" نہ ہو۔"** [12]

اس حدیث کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے تراویح کو باجماعت ادا کرنے کا اہتمام کیا۔ بظاہر یہ ایک نیا کام (یعنی بدعت) ہے جس کو حضرت عمرؓ نے ایجاد کیا اور دین میں داخل کیا کیونکہ باجماعت نماز تراویح نبی کریم ﷺ کے دور میں نہیں پڑھی جاتی تھی۔ اس عمل کو بدعت ضلالة اسلئے نہیں کہا گیا کہ یہ کوئی نیا حکم یا دین میں اضافہ نہیں تھا بلکہ پہلے سے موجود ایک مستحب

---

[8] مسلم، الصحیح، ۲:۷۰۵، کتاب الزکوة، باب الحث علی الصدقه، رقم:۱۰۱۷:::نسائی، السنن، ۵:۵۵، کتاب الزکوة، باب التحریض علی الصدقه، رقم:۲۵۵۴

[9] احمد بن حنبل، المسند، ۵:۲۴۶، رقم:۲۲۴۷۵

[10] ایضا"، ابوداود، السنن، کتاب الصلوة، باب کیف الاذان، ۱:۱۳۹، رقم:۵۰۶

[11] مسلم، الصحیح، ۲:۷۰۵، کتاب الزکوة، باب الحث علی الصدقه، رقم:۱۰۱۷

[12] بخاری، الصحیح، ۲:۹۵۹، کتاب الصلح، باب اذا اصلحوا علی صلح جور، رقم:۲۵۵۰

عمل یعنی نماز تراویح کو باجماعت شکل دینا تھا۔ لہذا اب ہم یہ باآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ "وہ نیا کام مردود ہوگا جو اس دین میں اصلا" نہ ہو" کا کیا مطلب ہے۔

لہٰذا اس حدیث کا اطلاق اس طرح کے اقدامات پر نہیں ہوتا کیونکہ نماز تراویح اصلا" پہلے سے دین میں موجود تھی اور حضرت عمرؓ نے صرف اُس کے باجماعت ادا کرنے کا اہتمام کیا۔ یعنی یہ عمل پہلے سے موجود ایک سنت کے مطابق تھا۔ اسی طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ نے قرآن مجید کو جمع کروایا اور ایک نسخے میں اکٹھا کیا، حضرت عثمان غنیؓ نے جمعے کی نماز میں دوسری اذان کو جاری کیا۔ یہ سب بدعتیں تھیں لیکن انکی اصل موجود تھی یعنی قرآن موجود تھا اُسے صرف اکٹھا کیا گیا، نماز جمعہ ادا کی جارہی تھی اور ضرورت کے تحت دوسری اذان کو جاری کیا گیا۔

دوسری حدیث مبارکہ میں فرمایا کہ "**ہر نیا کام (محدثة) بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔**"[13]
اوپر ذکر کی گئی دونوں احادیث کو ملا کر سمجھیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ صرف وہ نیا کام بدعت ضلالة (یعنی گمراہی) ہوگا جو نیا ہونے کے ساتھ ساتھ دین میں اصلا" بھی موجود نہ ہو۔

امام قرطبیؒ کہتے ہیں کہ وہ بدعت جسے گمراہی کہا گیا ہے اُس سے مراد وہ کام ہے جو کتاب و سنت اور عمل صحابہ کے مطابق نہ ہو۔ اسکے بعد امام قرطبیؒ اُس حدیث کا حوالہ دیتے ہیں جس میں آپ ﷺ نے کسی اچھے کام کی ابتدا کرنے پر اجر کی خوشخبری اور بُرے کام کی ابتدا کرنے والے پر وبال کی خبر دی ہے۔ آیئے بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کو مثالوں سے سمجھتے ہیں۔

بدعتِ حسنہ و بدعتِ سیئہ: عملی مثالیں

چاشت کی نماز: امام ابن ابی شیبہؒ (وفات 235 ہجری) نے حضرت اعرجؒ سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرؓ سے نماز چاشت کے متعلق سوال کیا جب وہ حضور نبی اکرم ﷺ کے حجرہ مبارک کے ساتھ پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے تو انہوں نے فرمایا کہ "بدعت ہے اور بہت اچھی بدعت ہے۔"[14]

یہاں سے پتہ چلا کہ صحابہ کرام کسی بھی نئے کام کے لیے بغیر تکلف کے لفظ بدعت استعمال کر لیتے تھے اور کسی کام کو بدعت کہنے سے نہ وہ آپس میں جھگڑتے تھے اور نہ ہی کفر کے فتوے صادر کرتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اُن کے ہاں لفظ بدعت اس معنی میں استعمال ہی نہیں ہوتا تھا جس معنی میں آج بعض لوگ کرتے ہیں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس قول پر کہ مسجد میں نماز چاشت کی ادائیگی بدعت ہے فورا" دوسرے صحابہ اور تابعین حضور ﷺ کی یہ حدیث پیش کرتے کہ کل بدعة ضلالة یعنی ہر نیا کام گمراہی ہے، لیکن ایسا نہیں ہوا کیونکہ اُن صحابہ کو شریعت کا صحیح فہم اور معرفت تھی اور وہ ہر بدعت کو گمراہی

---

13 ابوداود، السنن، کتاب السنه، باب فی لزوم السنه، ۴:۲۰۰، رقم:۴۶۰۷
14 ابن ابی شیبه، المصنف، ۲:۱۷۲:::عسقلانی، فتح الباری،۳:۵۲ ، رقم:۱۱۲۱

نہیں کہتے تھے بلکہ صرف اُس عمل کو بدعت ضلالة کہتے تھے جو قرآن اور سنت کے مخالف ہو۔اسی واقعے کو امام بخاریؒ (وفات 256ہجری) نے بھی بیان کیا ہے جس میں حضرت مجاہدؒ اور عروہ بن زبیرؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سوال کئے۔

صلاة التراویح: امام بخاری اپنی صحیح میں کتاب صلاة التراویح میں عبدالرحمن بن عبدالقاریؒ سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کے ساتھ رمضان کی ایک رات مسجد کی طرف نکلا تو لوگ علیحدہ علیحدہ نماز تراویح پڑھ رہے تھے۔ایک آدمی تنہا نماز پڑھ رہا تھا اور ایک آدمی گروہ کے ساتھ۔حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میرے خیال میں انہیں ایک قاری کے پیچھے جمع کر دیا جائے تو اچھا ہو گا۔پس آپؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ کے پیچھے سب کو جمع کر دیا۔پھر میں دوسری رات کو اُن کے ساتھ نکلا تو دیکھا کہ لوگ قاری کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔حضرت عمرؓ نے فرمایا: "نعمت البدعة هذا" یعنی "یہ کتنی اچھی بدعت ہے۔"[15]

قرآن کی جمع اور تدوین: امام شاطبیؒ (وفات 790ہجری) اپنی مشہور کتاب الاعتصام میں قرآن کی جمع اور تدوین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ قرآن کریم کو ایک نسخے میں جمع کرنے پر متفق ہو گئے، حالانکہ قرآن کریم کو جمع کرنے اور لکھنے کے بارے میں ان کے پاس کوئی واضح حکم نہیں تھا۔[16]

نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد جب صدیق اکبرؓ منصب خلافت پر فائز ہوئے تو اُس وقت جھوٹی نبوت کے دعویدار مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ یمامہ میں تقریباً 700 حفاظ قرآن صحابہ کرام شہید ہوئے۔سیدنا فاروق اعظمؓ نے محسوس کیا کہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور وہ صحابہ جن کے سینوں میں قرآن محفوظ ہے شہید ہوتے رہے تو عین ممکن ہے کہ آگے چل کر حفاظت قرآن میں خاصی دشواری پیش آئے۔لہٰذا آپؓ سیدنا صدیق اکبرؓ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ حفاظ صحابہ جنگوں میں شہید ہوتے جا رہے ہیں، کہیں حفاظت قرآن مسلمانوں کے لیے ایک مسئلہ نہ بن جائے، اس لیے میری یہ تجویز ہے کہ قرآن کو فوری طور پر ایک کتابی صورت میں اکٹھا کر دیا جائے اس طرح اس کی حفاظت کا بہتر اہتمام ہو سکے گا۔سیدنا صدیق اکبرؓ کا ذہن فوراً اس طرف گیا کہ جو کام حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں نہیں کیا وہ میں کیوں کروں۔لہٰذا انہوں نے فرمایا کہ: "میں ایسا کام کیسے کر سکتا ہوں جسے رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا۔"[17]

حضرت عمر فاروقؓ کی بصیرت افروز نگاہیں اس حکمت اور مصلحت اور بھلائی کا مشاہدہ کر رہی تھیں جو جمع قرآن میں مضمر تھی لہٰذا اُنہوں نے جواب دیا کہ اے امیر المومنین درست ہے کہ یہ کام ہمارے آقا ﷺ نے اپنی حیات مقدسہ میں نہیں کیا لیکن اللہ کی قسم ہے بہت اچھا اور بھلائی پر مبنی لہٰذا ہمیں اسے ضرور کرنا چاہیے۔اس بحث کے دوران سیدنا ابو بکرؓ نے فرمایا اے عمرؓ اللہ تیری قبر کو

---

15 بخاری، الصحیح، کتاب الصلوة التراویح، باب فضل من قیام رمضان، ۲:۷۰۷، رقم:۱۹۰۶

16 شاطبی، الاعتصام، ۲:۱۱۵

17 بخاری، الصحیح، کتاب التفسیر، باب قوله لقد جاءکم رسول، ۴:۱۷۲۰، رقم:۴۴۰۲

روشن کرے تو نے اپنی گفتگو سے میرے سینے کو روشن کر دیا۔

اس حدیث کے راوی حضرت زید بن ثابت انصاریؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ مجھ سے فرمانے لگے کہ آپ نوجوان اور سمجھدار شخص ہیں اس کے علاوہ آپ چونکہ کاتب وحی رہے ہیں اسلئے ہم آپ کو ہی اس کام پر مامور کرتے ہیں کہ آپ قرآن کو مختلف مقامات سے تلاش کر کے ایک جگہ جمع کر دیں۔

جمعے کی پہلی اذان: امام ابن ابی شیبہؒ (وفات 235 ہجری) نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ: "جمعے کی پہلی اذان بدعت ہے (یعنی بدعت حسنہ)"[18]۔ نماز جمعہ میں یہ اذان عہد عثمانی میں شروع کی گئی۔ امام بخاریؒ نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جمعے کے دن دوسری اذان کا حکم حضرت عثمانؓ نے دیا جب مسجد میں آنے والوں کی تعداد زیادہ ہو گئی۔ ابتدائی دورِ اسلام میں جمعہ کے دن صرف ایک ہی اذان ہوا کرتی تھی، جو کہ منبر پر امام کے بیٹھنے کے بعد دی جاتی تھی، اور اسی کے فوراً بعد خطبہ شروع کر دیا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں مدینہ منورہ کی آبادی کم تھی اور لوگ مسجدِ نبوی میں آسانی سے جمع ہو جاتے تھے۔ لیکن حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی، شہر وسیع ہو گیا اور بازاروں میں مصروفیت بھی زیادہ ہونے لگی۔ اس وجہ سے لوگوں کو مسجد کی طرف متوجہ کرنے اور نمازِ جمعہ کی تیاری کے لیے آپؓ نے مسجدِ نبوی سے کچھ فاصلے پر ایک اضافی اذان دینے کا حکم فرمایا، جو خطبے سے پہلے دی جانے والی اذان سے بھی پہلے دی جاتی تھی۔ یہ اضافی اذان دراصل ایک اعلامیہ یا اطلاع تھی تاکہ لوگ خرید و فروخت چھوڑ کر نمازِ جمعہ کے لیے مسجد کی طرف روانہ ہو جائیں۔

تالیف قلب کیلئے زکوٰۃ: تالیف قلب (یعنی کمزور ایمان والوں کیلئے مالی مدد) کے لیے زکوۃ دینے کا ثبوت قرآن پاک میں موجود ہے۔ سورۃ توبہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: "بے شک صدقات ایسے لوگوں کے لیے بھی ہیں جن کے دلوں میں اسلام کی محبت پیدا کرنا مقصود ہو[19]۔" کمزور ایمان والوں کو زکوٰۃ کی مد سے دینا خود نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ سیدنا عمر فاروقؓ نے عیینہ بن حسنؓ اور اقراء بن حبسؓ کو زکوۃ کا مال بطور تالیف قلب دینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ "رسول اللہ ﷺ تم دونوں کی تالیف (یعنی مالی مدد) اُس وقت کیا کرتے تھے جب کہ اسلام کمزور تھا اور مسلمان تعداد میں کم تھے۔ اب اللہ نے اسلام کو غنی کر دیا ہے تو تم لوگ جاؤ اور اپنی مالی جدوجہد کرو۔"[20]

تالیف قلب کے لیے زکوٰۃ دینے کے بارے میں حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ زکوٰۃ کی رقم سے مدد کرنا اس وقت ضروری تھا جب مسلمان کمزور تھے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اُن کے شر سے بچا جائے اور اُن کے دلوں کو مانوس کیا جائے، اس لئے اب جب کہ مسلمان

---

18 ابن ابی شیبہؒ، المصنف، ۱: ۴۷۰، رقم: ۵۴۳۷:::ابن حجر عسقلانیؒ، فتح الباری، ۲: ۳۹۴

19 القرآن، التوبہ، ۹: ۶۰

20 ابوبکر جصاص، احکام القرآن، ۳: ۲۴

کثیر تعداد میں ہیں اور انہیں قوت و عزت حاصل ہے تو اب کسی شخص کو تالیف قلب کی غرض سے مال زکوٰۃ میں سے دینا جائز نہیں ہے۔

پختہ اور خوبصورت مسجدوں کی تعمیر اور مسجدوں کے محراب بنوانا: اسلام کے شروع کے دور میں پکے مکانات بنانا ناپسند کیا جاتا تھا لہذا مسجد کو بھی پختہ کرنا ناجائز تصور کیا جاتا رہا۔ اسی طرح دور نبوی میں مسجد کے محراب کا بھی رواج نہیں تھا، علامہ نورالدین سمہودیؒ (وفات 911 ہجری) وفاءالوفاء میں ذکر کرتے ہیں کہ مسجدوں کے محراب حضور ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں نہیں تھے اور سب سے پہلے اسے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (وفات 101 ہجری) نے بنوایا[21]۔

اگر مسجدوں کی تعمیر میں تبدیلی پر غور کیا جائے تو اس کی مصلحت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اُس وقت لوگوں کے اپنے گھر کچے ہوتے تھے لہٰذا اللہ کے گھر کا کچا ہونا باعث شرم نہ تھا، لیکن جب لوگوں کے اپنے مکانات پختہ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کے گھر کی شان کے پیش نظر پختہ اور خوبصورت مسجدوں کی تعمیر کا فتوی دے دیا گیا۔

علامہ ابن اثیر جزریؒ کا نقطہ نظر

علامہ ابن اثیر جزریؒ (وفات ۶۰۶ ہجری) بدعت کی اقسام اور ان کا شرعی مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "بدعت کی دو قسمیں ہیں بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ۔ جو کام اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے خلاف ہو وہ مذمت کے قابل ہے اور منع ہے اور جس کام کو اللہ تعالیٰ نے مستحب قرار دیا ہو یا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے اُس کا شوق دلایا ہو، اُس کام کا کرنا قابل ستائش ہے۔ اور جو کام نئے ہیں، وہ اچھے کام ہیں بشرطیکہ وہ خلاف شرع نہ ہوں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے کاموں پر ثواب کی بشارت دی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے اچھے کام کی ابتدا کی اس کو اپنا اجر بھی ملے گا اور جو لوگ اس کام کو کریں گے اُن کے عمل کا اجر بھی ملے گا۔ اور اس کے برعکس جو بُرے کام کی ابتدا کرے گا اس کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اُس پر اپنی برائی کا وبال بھی ہو گا اور جو اس برائی کو کریں گے اُن کا وبال بھی اُس پر ہو گا۔

بدعت حسنہ کے بارے میں سیدنا عمر فاروقؓ کا یہ قول "نعمت البدعة هذا" یعنی یہ کتنی اچھی بدعت ہے (یہ الفاظ آپؓ نے نماز تراویح کا باجماعت اہتمام کرنے کے بعد کہے) موجود ہے۔ پس جب نیا کام خیر میں سے ہو تو اُس کی تعریف کی جائے گی۔ حضور ﷺ نے باجماعت نماز تراویح کو چند راتیں پڑھ کر باجماعت پڑھنا ترک کر دیا، بعد میں صدیق اکبرؓ کے دور میں بھی اس کو باجماعت نہیں پڑھا گیا۔ پھر سیدنا عمر فاروقؓ کا دور آیا تو آپؓ نے لوگوں کو اس پر جمع کیا، اُن کو اس کی طرف متوجہ کیا، پس اس وجہ سے اس کو بدعت کہا گیا۔"[22]

---

[21] سمہودیؒ، وفا إلوفاء، ۳۷۲:۱۰

[22] مسلم، الصحیح، ۷۰۵:۲، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی الصدقه، رقم:۱۰۱۷،:::مالک، الموطاء، باب ما جاء فی قیام رمضان، ۱۱۴:۱، رقم:۲۵۰،:::ابوداود السنن، ۲۰۰:۴، کتاب السنه، باب فی لزوم السنه، رقم: ۴۶۰۷

علامہ ابن اثیر جزریؒ جیسے خیالات کا اظہار مختلف ادوار میں مختلف علماء، فقہاءاور آئمہ کرام کی جانب سے کیا جاتا رہا ہے۔ مضمون کی طوالت سے بچنے کیلئے اُن کے صرف نام نیچے بیان کئے جا رہے ہیں:

امام نوویؒ (وفات 676ہجری)[23]، امام شہاب الدین احمد الکرافی المالکیؒ (وفات 684ہجری)[24]، امام ابن تیمیہؒ (وفات 728ہجری)[25]، حافظ ابن کثیرؒ (وفات 774ہجری)[26]، علامہ ابواسحاق شاطبیؒ (وفات 790ہجری)[27]، علامہ بدر الدین محمد بن عبداللہ زرکشیؒ (وفات 794ہجری)[28]، شمس الدین محمد بن یوسف بن علی الکرمانیؒ (وفات 796ہجری)[29]، علامہ ابوعبداللہ محمد بن خلفہ الوشتانی المالکیؒ (وفات 828ہجری)[30]، علامہ ابن حجر عسقلانیؒ (وفات 852ہجری)[31]، امام بدر الدین عینیؒ (وفات 855ہجری)[32]، علامہ شمس الدین سخاویؒ (وفات 902ہجری)[33]، امام جلال الدین سیوطیؒ (وفات 911ہجری)[34]، علامہ شہاب الدین احمد قسطلانیؒ (وفات 911ہجری)[35]، امام محمد بن یوسف صالحیؒ شامیؒ (وفات 942ہجری)[36]، امام عبدالوہاب بن احمد علی الشعرانیؒ (وفات 973ہجری)[37]، ملا علی قاریؒ کے استاد امام ابن حجر مکی الہیثمیؒ (وفات 974ہجری)[38]، شیخ محمد شمس الدین الشربینی الخطیبؒ (وفات 977ہجری)[39]، ملا علی قاریؒ (وفات 1014ہجری)[40]، امام محمد عبدالرؤف المناویؒ (وفات 1031ہجری)[41]، علامہ حلبیؒ (وفات 1044ہجری)[42]، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (وفات 1052ہجری)[43]، یمن کے معروف غیر مقلد عالم شیخ شوکانیؒ (وفات 1255ہجری)[44]، علامہ شہاب الدین سید محمود آلوسیؒ (وفات 1270ہجری)[45]، مولانا احمد علی سہارنپوریؒ (وفات 1297ہجری)[46]، نامور غیر مقلد عالم دین نواب صدیق حسن خان بھوپالیؒ (وفات 1307ہجری)[47]، مولانا عبدالرحمن مبارکپوریؒ (وفات 1353ہجری)[48]، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (وفات 1369ہجری)[49]، مولانا محمد زکریا

---

23 امام نوویؒ، تہذیب الاسماء واللغات
24 امام شہاب الدینؒ،انوارالبروق فی انوارالفروق
25 ابن تیمیہؒ، منہاج السنہ، ۲۲۴:۴؛:::ابن تیمیہؒ، کتب و رسائل و فتاویٰ ابن تیمیہ فی الفقہ، ۱٦:۲۰
26 ابن کثیرؒ، تفسیرالقرآن العظیم، ۱٦۱:۱
27 شاطبیؒ، الاعتصام، ۱۱۱:۲
28 زرکشیؒ، المنشور فی القواعد، ۲۱۷:۱
29 الکرمانیؒ، الکواکب الدراری فی شرح صحیح البخاری
30 وشتانیؒ، اکمال اکمال المعلم، ۱۰۹:۷
31 عسقلانیؒ، فتح الباری شرح صحیح البخاری، ۲۵۳:۴
32 عینیؒ، عمدہ القاری شرح صحیح البخاری، ۱۲٦:۱۱
33 سخاویؒ، القول البدیع فی الصلاۃ علی الحبیب الشفیع:۱۹۳
34 سیوطیؒ، الحاوی للفتاویٰ، ۱۹۲:۱؛:::سیوطیؒ، شرح سنن ابن ماجہ،٦:۱:::سیوطیؒ، الدیباج علی صحیح مسلم بن الحجاج،۴۴۵:۲
35 قسطلانیؒ، ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری، ۴۴٦:۳
36 صالحیؒ، سبل الھدیٰ والرشاد، ۳۷۰:۱
37 شعرانیؒ، الیواقیت والجواھر فی بیان عقائد الاکبر، ۲۸۸:۲
38 ابن حجر مکیؒ، الفتاویٰ الحدیثیہ، ۱۳۰
39 شربینیؒ، مغنی المحتاج الی معرفہ معانی الفاظ المنہاج، ۴۳٦:۴
40 ملا علی قاریؒ، مرقاۃ المفاتیج شرح مشکاۃ المصابیح،۲۱٦:۱
41 مناویؒ، فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، ۴۳۹:۱
42 حلبیؒ، السیرۃ الحلبیۃ، ۸۳:۱
43 عبدالحق محدث دہلویؒ، اشعہ اللمعات، باب الاعتصام بالکتاب والسنہ، ۱۲۵:۱
44 شوکانیؒ، نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار، ٦۳:۳
45 آلوسیؒ، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ۱۹۲:۱۴
46 سہارنپوریؒ، حاشیہ بخاری، ۲٦۹:۱
47 شیخ وحیدالزمانؒ، ہدیہ المہدی:۱۱۷
48 مبارکپوریؒ، جامع الترمذی مع شرح تحفہ الاحوذی، ۳۷۸:۳
49 عثمانیؒ، فتح الملہم شرح صحیح مسلم، ۴۰٦:۲

کاندھلویؒ(وفات1402ہجری)[50]، سعودی عرب کے معروف مفتی شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن بازؒ(وفات1421ہجری)[51]اور مکہ مکرمہ کے معروف عالم دین شیخ سید محمد بن علوی المالکی الحسنیؒ(وفات1425ہجری)۔[52]

بدعتوں کا آغاز حضور ﷺ کے وصال کے فورا" بعد ہوا

امام ابوداؤدؒ(وفات275ہجری)نے کتاب وسنہ کے ذیل میں "باب فی الروم السنة" میں ایک حدیث بیان کی ہے جس کے راوی حضرت عرباض بن ساریہؓ ہیں۔اسی حدیث کو امام طبرانیؒ(وفات360ہجری)[53]نے بھی تقریبا انہی الفاظ میں اپنی کتاب المعجم الکبیر میں حضرت عرباض بن ساریہؓ سے ہی روایت کیا ہے،بیان کرتے ہیں کہ :

ایک روز حضور نبی اکرم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی پھر ہماری جانب متوجہ ہو کر دل میں اتر جانے والی نصیحتیں فرمائیں جن سے آنکھیں بہنے لگیں اور دل کانپ اٹھے،ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ یہ تو الوداعی نصیحت معلوم ہوتی ہے لہذا ہمیں کوئی وصیت فرمایئے۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:"میں تمہیں تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں اور امیر کے فرمانبردار رہنے کی،خواہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو کیونکہ جو تم میں سے میرے بعد زندہ رہا تو وہ عنقریب بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا۔پس تم پر میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت پر قائم رہنا لازم ہے۔اس کو تھامے رہنا اور اسے دانتوں کے ساتھ مضبوطی سے پکڑے رکھنا،دین میں جو نئے کام(محدثات الامور)داخل کیے جائیں اُن سے بچتے رہنا کیونکہ ہر نیا کام بدعت ہے(کل محدثه بدعته)اور ہر بدعت گمراہی ہے(کل بدعته ضلاله)۔"[54]

اس حدیث مبارکہ میں چند اہم امور ترتیب سے سمجھنے کی ضرورت ہے:

پہلی بات: جب صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! ہمیں کوئی وصیت فرمائیں تو آپ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔

دوسری بات: فرمایا کہ اگر تم پر حبشی غلام بھی خلیفہ یا سربراہ مقرر کر دیا جائے تب بھی اس کی بات سننا اور اطاعت کرنا۔

تیسری بات: آپ ﷺ نے دور فتن کے تعین کا اشارہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے میرے صحابہ! میرے وصال کے بعد تم میں سے جو بھی زندہ رہا تو وہ عنقریب کثرت کے ساتھ اختلاف دیکھے گا۔جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اختلاف کثیر، گروہ بندیاں اور فتنے جن کا ذکر حضور ﷺ فرما رہے ہیں اُن کا تعلق صدیوں بعد کے فتنوں سے نہیں ہے بلکہ یہ حضور ﷺ کے وصال فرمانے کے فورا" بعد، دور صحابہ اور دور خلفائے راشدین میں رُونما ہوں گے۔یعنی اُن اختلافات اور فتنوں کی زد میں براہ راست خلفائے راشدین آئیں گے۔

---

50 کاندھلویؒ، اوجز المسالک الی موطا مالک، ۲:۲۹۷

51 ابن بازؒ، فتاویٰ اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء،۲:۳۲۵

52 علوی المالکیؒ، مفاهیم یجب ان تصحح:۱۰۲

53 طبرانیؒ، المعجم الکبیر، ۱۸:۲۴۸

54 ابوداودؒ، السنن، کتاب السنة، باب فی لزوم السنة، ۴:۲۰۰، رقم:۴۶۰۷

اُن مشکل حالات میں حضور ﷺ نے اُمت کی رہنمائی کے لیے ضابطے کا اعلان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ میرے فوری بعد دور فتن میں جب دھڑے بندیاں اور گروہ بندیاں شروع ہو جائیں اور لوگ پریشان ہونے لگیں کہ کس کی مانیں اور کس کی نہ مانیں تو تذبذب اور تردد کا شکار ہونے کی بجائے میری اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کو تھامے رکھنا۔

حضور ﷺ نے بدعت کا سارا زمانہ اور اُن کی نوعیت متعین فرمانے کے بعد پھر ارشاد فرمایا کہ ان نئے کاموں (محدثات الامور) سے بچتے رہنا کیونکہ ہر نیا کام بدعت ہے (کل محدثه بدعته) اور ہر بدعت گمراہی ہے (کل بدعته ضلاله)۔ اس حدیث مبارکہ پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ محدثات الامور وہ فتنے ہیں جو حضور ﷺ کے وصال کے فورا" بعد خلفائے راشدین کے زمانے میں ظاہر ہوئے جیسے زکوٰۃ دینے سے انکار، جھوٹی نبوت کے دعوے، فتنہ ارتداد (ارتداد سے مراد کسی مسلمان کا اسلام چھوڑ کر کفر اختیار کر لینا ہے) اور فتنہ خوارج وغیرہ۔

لہٰذا آپ ﷺ کے وصال کے بعد بعض لوگوں نے نبی ہونے کا دعوی کر دیا، کئی قبیلے مرتد ہو گئے اور بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ اُن کی سرکوبی کے لیے سیدنا صدیق اکبرؓ نے افواج بھیجیں۔ سرور دو عالم ﷺ کے وصال کے فورا بعد خلفائے راشدین کے زمانے میں جو بڑے بڑے فتنے رُونما ہوئے وہ یہ ہیں:

جھوٹی نبوت کے دعوے داروں کا فتنہ: حضور ﷺ کے وصال کے فورا بعد جھوٹے نبیوں کے فتنے نے سر اٹھایا۔ اُن میں اسود عنسی، طلیحہ اسدی، مسیلمہ کذاب، سجاح بنت حارثہ تمیمہ شامل ہیں۔

فتنہ ارتداد: حضور ﷺ کے وصال فرمانے کے ساتھ ہی ایک اور فتنہ رُونما ہوا جسے فتنہ ارتداد کہتے ہیں۔ عرب کے کئی نو مسلم قبائل اسلام سے پھر گئے اور دوبارہ اپنی پرانی روش پر چل نکلے۔ اس پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جرات کے ساتھ اس فتنے کا خاتمہ کیا۔ امام طبریؒ (وفات 310 ہجری) آپ ﷺ کے وصال کے بعد قبائل عرب میں فتنہ ارتداد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت اسامہؓ لشکر لے کر روانہ ہوئے تو اُن کے بعد سرزمین عرب اسلام سے بغاوت پر اُتر آئی اور تمام قبائل میں سے لوگ چاہے عام ہوں یا خاص سوائے قریش اور ثقیف کے سرکش اور مرتد ہو گئے۔ اس کی تفصیل کو امام جلال الدین سیوطیؒ (وفات 911 ہجری) نے اپنی کتاب تاریخ الخلفاء میں بیان کیا ہے۔

فتنہ منکرین زکوٰۃ: آپ ﷺ کے وصال کے بعد پے در پے سر اُٹھانے والے فتنوں میں تیسرا اہم فتنہ منکرین زکوٰۃ کا تھا۔ یہ گروہ چونکہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا اور صرف زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر رہا تھا اس لیے ان کے خلاف تلوار اٹھانے کے متعلق خود صحابہ کرام میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ امام بخاریؒ (وفات 256 ہجری) بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر حضرت عمرؓ جیسے صحابی نے خلیفہ وقت حضرت ابو بکر صدیقؓ کو ان کے خلاف قتال سے روکنا چاہا۔ حضرت عمر فاروقؓ کا موقف تھا کہ آپ ایک ایسی جماعت کے خلاف کس

طرح جنگ کر سکتے ہیں جو توحید اور رسالت کا اقرار کرتی ہے اور صرف زکوٰۃ کی منکر ہے۔ لیکن خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ارادہ اس اختلاف رائے سے متاثر نہ ہوا۔ اس جرات مندانہ اور فیصلہ کن اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی سی تنبیہ اور کاروائی کے بعد تمام منکرین خود زکوٰۃ لے کر بارگاہ خلافت میں حاضر ہوئے اور پھر حضرت عمر فاروقؓ کو بھی حضرت ابو بکر صدیقؓ کی پختہ رائے اور درست فیصلے کا اعتراف کرنا پڑا۔

فتنہ خوارج: اسلام کو درپیش چوتھا بڑا فتنہ خوارج کا تھا، جو حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں صفین کی جنگ کے بعد ظاہر ہوا۔ انہوں نے "لا حکم الا اللہ" کا نعرہ لگا کر مسلمانوں، خصوصاً حضرت علیؓ اور ان کے پیروکاروں کو بدعتی اور مشرک کہنا شروع کیا۔ نہروان میں ان کا مقابلہ حضرت علیؓ سے ہوا اور یہ فتنہ اپنے انجام کو پہنچا۔ خوارج کی پہچان یہ تھی کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو کافر قرار دیتے اور اُن کا خون حلال سمجھتے۔ یہ سارا زور توحید پر صرف کرتے اور جمہور اُمت مسلمہ (مسلمانوں کے بڑے گروہ) کو مشرک اور بدعتی قرار دیتے ۔امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ خوارج کو اللہ تعالی کی بدترین مخلوق سمجھتے تھے کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وہ آیات جو کفار کے حق میں نازل ہوئیں تھیں اُن کا اطلاق مومنین پر کرنا شروع کر دیا تھا۔

لہٰذا یہ چاروں گروہ یعنی مدعیانِ نبوت، منکرینِ زکوٰۃ، مرتدین اور خوارج، صحیح روایات کے مطابق وہی بڑے اختلافات اور فتنے تھے جن کی خبر نبی کریم ﷺ نے پہلے ہی دے دی تھی۔

کیا ہر بدعت "بدعة ضلالة" ہے

کوئی شخص یہاں پر اعتراض کر سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تو فرمایا ہے: كل بدعة ضلالة یعنی ہر بدعت کو ضلالة (یعنی گمراہی) فرمایا ہے، پھر بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کی تقسیم کہاں سے نکل آئی۔ اس اعتراض کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ تقسیم نئی نہیں بلکہ شروع سے لے کر آج تک تمام اکابر آئمہ اور محدثین نے حدیث نبوی کی روشنی میں بدعت کی یہی تقسیم بیان کی ہے۔

یہاں پر امام مسلمؒ (وفات 261 ہجری) کی بیان کردہ وہ حدیث مبارکہ وضاحت کے لیے پیش کی جاتی ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ:
"جس شخص نے مسلمانوں میں کسی نیک طریقے کی ابتدا کی اور اس کے بعد اُس طریقے پر عمل کیا گیا تو اُس طریقے پر عمل کرنے والوں کا اجر بھی اُس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا اور عمل کرنے والوں کے اجر میں کمی نہیں ہو گی اور جس شخص نے مسلمانوں میں کسی برے طریقے کی ابتدا کی اور اس کے بعد اس طریقے پر عمل کیا گیا تو اُس طریقے پر عمل کرنے والوں کا گناہ بھی اُس شخص کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا اور عمل کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔"[55]

دوسرے لفظوں میں اسے بدعت خیر اور بدعت شر بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس کے متعلق حضور ﷺ نے اس حدیث مبارکہ میں

[55] مسلم، الصحيح، كتاب العلم، باب من سن سنة حسنة او سيئة، ۲۰۵۹:۴، رقم: ۲۶۷۴

بات کی ہے کہ جس نے کوئی نیا کام کیا جو میری سنت میں نہیں تھا، یعنی بدعت تھا مگر خیر اور بھلائی کا کام تھا تو اُس کے لیے اجر ہے۔ اسی طرح اگر شر اور برائی کی بدعت کا آغاز کیا تو اُس پر گناہ ہے۔

بدعت سے مراد ارتداد کی سطح کے فتنے ہیں

بیان کی گئی احادیث مبارکہ سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ فتنے جنھیں بدعت کہا گیا اُس سے مراد ارتداد یعنی کفر کا باعث بننے والے اختلافات تھے جن کا ارتکاب کرنے والے وہ لوگ تھے جو حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور بعد میں مرتدین، منکرین زکوٰۃ، جھوٹے نبوت کے دعوے داروں اور خوارج کے حامی ہو گئے۔

یعنی اگر کوئی نئی نبوت کا اعلان کرے، نئی کتاب یا نیا دین گھڑ دے، نیا کعبہ بنا دے، ارکان دین کو پانچ کی بجائے سات کر دے، نمازیں پانچ کی بجائے چھ یا تین کر دے، اساس دین (وہ بنیادی اصول جن پر پورا دین قائم ہے) میں کمی یا زیادتی کر دے، الغرض دین میں ایسی کمی یا اضافہ جو ارتداد کا باعث ہو، چاہے وہ کسی وقت اور کسی بھی زمانے میں ہو وہ بدعت، ضلالت اور گمراہی ہو گا۔

لہذا اب قیامت تک بھی اگر کسی دور میں اس نوعیت کے عقیدے اور عمل کو دین کی طرف منسوب کیا جائے تو وہ بدعته ضلاله میں شمار ہوں گے جیسے فتنہ قادیانیت، فتنہ بہائیت وغیرہ اور اس کے ماننے والوں کا گروہ بدعته ضلاله کا مرتکب ہو گا۔ اُن کے لیے وہی حکم ہو گا جو خلفائے راشدین کے دور میں بدعته ضلاله کے مرتکب افراد کیلئے تھا۔

مزید وضاحت کے لیے صحیح بخاری کی کتاب التفسیر سے ایک بہت اہم حدیث پیش کرتے ہیں جسے امام بخاریؒ (وفات 256 ہجری) کے علاوہ امام مسلمؒ (وفات 201 ہجری) نے کتاب الجنة میں امام ترمذیؒ (وفات 279 ہجری) نے کتاب التفسیر میں اور امام نسائیؒ (وفات 303 ہجری) نے کتاب الجنائز میں بیان کیا ہے۔ ان کے علاوہ اکثر و بیشتر محدثین نے اس حدیث کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ (وفات 68 ہجری) سے روایت ہے کہ ایک روز حضور نبی اکرم ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"اے لوگو! تم اللہ کے پاس ننگے پیر ننگے بدن اور بغیر ختنے کے جمع کیے جاؤ گے"۔ پھر سورۃ الانبیاء کی یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی:

"جس طرح ہم نے کائنات کو پہلی بار پیدا کیا تھا ہم اس کے ختم ہو جانے کے بعد اسی عمل تخلیق کو دہرائیں گے یہ وعدہ پورا کرنا ہم نے لازم کر لیا ہے ہم ضرور کرنے والے ہیں۔"[56]

پھر فرمایا "سنو! مخلوق میں سب سے پہلے ابراہیمؑ کو لباس پہنایا جائے گا، سنو بے شک میری امت میں سے کچھ لوگوں کو لایا جائے گا، ان کو بائیں جانب سے پکڑ لیا جائے گا، میں کہوں گا اے میرے رب! یہ میرے اصحاب ہیں، کہا جائے گا کیا آپ نہیں جانتے کہ

[56] الانبیاء، ۲۱:۱۰۴

انہوں نے آپ کے بعد دین میں کیا کیا فتنے نکالے تھے۔ بس میں وہی کہوں گا جو اللہ کے ایک نیک بندے عیسیٰؑ نے کہا: اور میں ان کے عقائد و اعمال پر اُس وقت تک خبر دار رہا جب تک میں ان لوگوں میں موجود رہا۔ پھر جب تو نے مجھے اٹھالیا تو تو ہی ان کے حالات پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔ اگر تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو بے شک تو ہی بڑا غالب حکمت والا ہے۔ پھر مجھ سے کہا جائے گا کہ جیسے ہی آپ ﷺ ان سے جدا ہوئے یہ اُسی وقت مرتد ہو گئے تھے۔"[57]

اس حدیث مبارکہ میں بھی جن فتنوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ حضور ﷺ کے وصال کے فوراً بعد خُلفائے راشدین کے زمانے میں رونما ہوئے اور یہ وہی ارتداد کی سطح کے فتنے ہیں جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ بعض قبائل اور لوگ کثرت سے فتوحات دیکھ کر اسلام میں داخل ہو گئے تھے لیکن ابھی ایمان پورے طور پر اُن کے دلوں میں نہیں اترا تھا، دنیاوی مال و دولت کی محبت غالب تھی۔ جونہی نبی کریم ﷺ کا وصال ہوا تو اُن میں سے کچھ لوگ مرتد ہو گئے، کسی نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور کسی نے جھوٹی نبوت کا دعوی کر دیا۔

اس بیان سے واضح ہو گیا کہ دین میں ایسا فتنہ پیدا کرنا جو کفر کا باعث ہو، بدعت اور گمراہی ہے۔ مختلف احادیث میں فتنہ و فساد کے مرتکب افراد کو واضح طور پر مرتدین (یعنی جو مسلمان ہونے کے بعد کسی اور دین کو اختیار کر لیں) قرار دیا گیا ہے۔ اسی بدعت کی مختلف شکلیں وہ ہیں جو حضور ﷺ کے زمانے کے فوری بعد پیدا ہوئیں جیسے فتنہ خوارج، اور انہی کی طرح دیگر فتنے بعد کے دور میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں جیسے فتنہ قادیانیت وغیرہ۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بدعت کا اطلاق صرف ارتداد کی سطح کے اُمور پر ہو گا نہ کہ دین کے چھوٹے چھوٹے بھلائی اور نیکی کے کاموں پر۔

بدعتوں کا تعلق دور خلفائے راشدین سے ہے

یہ بات طے ہو گئی ہے کہ جن فتنوں یا بدعتوں کا ذکر حضور ﷺ فرما رہے ہیں اُن کا تعلق صرف اور صرف خلفائے راشدین کے زمانے کے ساتھ ہے، باقی اُمت کے نیک اعمال اور بھلائی کے کاموں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ہاں اُن نئے نیکی اور بھلائی کے کاموں کی حیثیت کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے کہ یہ مستحب ہیں (مستحب وہ نیکی یا عمل ہوتا ہے جسے کرنا ثواب ہے، لیکن نہ کرنے پر گناہ نہیں ہوتا جیسے مسواک کرنا، سلام میں پہل کرنا، نفل پڑھنا وغیرہ) یا غیر مستحب، مباح ہیں (یعنی وہ جائز اور حلال کام جس پر نہ ثواب ہے اور نہ ہی گناہ، جیسے پانی پینا، کرسی پر بیٹھنا، گاڑی میں سفر کرنا وغیرہ) یا مکروہ، افضل ہیں یا غیر افضل۔ علمی اختلاف جو چاہیں کریں مگر انہیں بدعت (یعنی گمراہی) کہنا صحیح نہیں۔

---

[57] بخاری، الصحیح، ۴:۱۶۹۱، کتاب التفسیر، باب و کنت علیهم شهیدا، رقم: ۴۳۴۹ ::: مسلم، الصحیح، ۴:۲۱۹۴، کتاب الجنة، باب فناء الدنیا، رقم: ۲۸۶۰ ::: ترمذی، السنن، ۵:۳۲۱، کتاب التفسیر، باب من سورة الانبیاء، رقم: ۳۱۶۷

بدعتوں کا آغاز اُن لوگوں کی طرف سے ہوا جو پہلے آپ ﷺ کے ساتھ تھے، مگر آپ ﷺ کے وصال کے بعد خلفائے راشدین کے ساتھ اُن کا اختلاف ہوا اور اس کی وجہ سے وہ گمراہ ہو گئے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ہے کہ جب انہیں دوزخ کی طرف دھکیلا جا رہا ہو گا تو حضور ﷺ اللہ کی بارگاہ میں عرض کریں گے کہ یارب اصحابی یعنی یااللہ! یہ تو میرے اصحاب ہیں، جواب ملے گا کہ جب آپ ان سے جدا ہوئے تو یہ اپنی ایڑیوں کے بل دین سے پھر گئے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ اگر احادیث کی تمام کتابوں میں اس حدیث کو دیکھا جائے تو سب میں دو باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ پہلا لفظ اصحابی یعنی میرے اصحاب اور دوسرا یہ کہ ان بدعتوں کا تعلق اُن لوگوں سے ہے جو پہلے آپ ﷺ کے ساتھ تھے مگر خلفائے راشدین کے دور میں یہ لوگ گمراہ ہو گئے۔

اس موقف کی تائید صحیح بخاری میں ہی امام بخاریؒ (وفات 256 ہجری) کے شاگرد محمد بن یوسف الفربریؒ کی اس روایت سے ہوتی ہے۔ محمد بن یوسف الفربریؒ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ، قبیصہ سے روایت کرتے ہیں کہ فتنوں (یعنی احداث اور بدعتوں) میں مبتلا افراد سے مراد وہ مرتدین ہیں جو حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد میں دین سے پھر گئے تھے تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اُن سے قتال کیا۔[58]

بدعته ضلالة اختیار کرنے سے ایک سنت اُٹھالی جاتی ہے

امام ترمذیؒ، حضرت بلال بن حارثؓ کی روایت کو بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"جس نے میرے بعد کوئی ایسی سنت زندہ کی جو مردہ ہو چکی تھی تو اُس کے لیے بھی اتنا ہی اجر ہو گا جتنا اُس پر دیگر عمل کرنے والوں کے لیے، اس کے باوجود ان کے اجر اور ثواب میں کوئی کمی نہیں آئے گی اور جس نے گمراہی کی بدعت (حدیث میں "بدعته ضلالة" کے الفاظ ہیں) نکالی جسے اللہ اور اس کا رسول پسند نہیں کرتے تو اُس پر اُتنا ہی گناہ ہے جتنا اُس برائی کا ارتکاب کرنے دیگر لوگوں پر ہے اور اُس سے اُن کے گناہوں کے بوجھ میں بالکل کمی نہیں آئے گی۔"[59]

اس حدیث مبارکہ میں مردہ سنت کو بدعته ضلالة کے مقابلے میں ذکر کیا گیا ہے۔ جس حدیث مبارکہ میں خصوصی طور پر سنت کو بدعت (بدعته ضلالة) کے مقابلے میں ذکر کیا جائے وہ ایسی بدعت (بدعته ضلالة) ہوتی ہے کہ جس کے کرنے سے کوئی نہ کوئی سنت ترک ہوتی ہے۔ اس موقف کی تائید مسند احمد کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: "جب کوئی قوم دین میں بدعت کا آغاز کرتی ہے تو اُس کے مثل ایک سنت اُٹھالی جاتی ہے لہٰذا سنت کو مضبوطی سے پکڑنا۔"[60]

---

58 بخاری، الصحیح، کتاب الدنیا، باب قول اللہ تعالیٰ و اذکر فی الکتاب مریم، ۳:۱۲۷۱، رقم:۳۲۶۳

59 ترمذی، السنن، کتاب العلم، باب ما جاء فی الاخذ بالسنة الجتناب البدع،۵:۴۵،رقم:۲۶۷۷

60 احمد بن حنبلؒ، المسند، ۴:۱۰۵، رقم:۱۷۰۹۵

اسی لیے اس حدیث مبارکہ میں بدعتہ ضلالۃ کے لیے فرمایا گیا کہ جس نے اس کے مقابلے میں سنت کو زندہ کیا اُس کے لیے اجر ہے اور جس نے ایسی بدعت کی راہ نکالی جو سنت کے ترک کا باعث ہو تو وہ گمراہی ہے۔

دوسرا اہم نقطہ یہ ہے کہ اس حدیث مبارکہ میں آپ ﷺ نے "بدعتہ ضلالۃ" کے الفاظ ادا فرمائے ہیں لہٰذا آپ ﷺ نے واضح کر دیا کہ میری مراد یہاں نیکی اور بھلائی کے نیک کام نہیں بلکہ برائی اور گمراہی کے کام ہیں اور آپ ﷺ نے اس بات کو متعین فرمادیا کہ ہر بدعت گمراہی نہیں بلکہ صرف وہ بدعت گمراہی ہوگی جو مبنی بر ضلالت ہوگی۔

لہٰذا اب اگر کوئی یہ کہے کہ دین میں ہر نیا کام بدعت ہوتا ہے تو اس کے مقابلے میں کہا جائے گا کہ نہیں بلکہ صرف بدعتہ ضلالۃ ہی باعث ضلالت ہوگی۔ کیونکہ حضور ﷺ نے بدعتہ ضلالۃ کے معنی کو خود متعین فرمادیا ہے کہ کوئی عمل اُس وقت تک بدعتہ ضلالۃ نہیں ہوگا جب تک وہ کسی خاص سنت کے ترک ہو جانے کا سبب نہ بنے۔

معروف اہل حدیث عالم مولانا صدیق حسن خان بھوپالی (وفات 1307 ہجری) بھی واضح طور پر لکھتے ہیں کہ ہر نئے کام کو بدعت کہہ کر مطعون (یعنی بُرا بھلا) نہیں کہا جائے گا بلکہ بدعت (یعنی بدعتہ ضلالۃ) صرف اُس کام کو کہا جائے گا جس سے کوئی سنت ترک ہو اور جو نیا کام شریعت کے خلاف نہ ہو وہ بدعت نہیں بلکہ مباح اور جائز ہے۔[61]

کوئی بھی نیا کام اس وقت ناجائز اور حرام قرار پاتا ہے جب وہ شریعت کے کسی حکم کی مخالفت کر رہا ہو اور اسے دین کی ضرورت سمجھ کر پیروی کے لائق ٹھہرا لیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی بھی بدعت حسنہ کو ضروریات دین شمار کرتے ہوئے اس کے نہ کرنے والے کو گناہ گار اور کرنے والے کو ہی مسلمان سمجھا جائے تو اس صورت میں بدعت حسنہ بھی ناجائز بن جاتی ہے۔ مثلاً مقلد یا اہل حدیث حضرات نعت خوانی کے اجتماعات کو جائز نہیں سمجھتے اور میلاد النبی ﷺ کو نہیں مناتے۔ لہٰذا ان اُمور کو ضروریات دین شمار کرتے ہوئے انھیں نہ کرنے والوں کو گناہ گار سمجھنا غلط اور غیر شرعی تصور ہوگا۔

لہٰذا بدعت سے مراد ہرگز ہرگز چھوٹے ہلکی نوعیت کے اختلافات نہیں بلکہ ان سے مراد اُس سطح کے فتنے ہیں کہ اُن میں سے ہر فتنہ ارتداد کا باعث بنے، آپ ﷺ کی سنت کو منقطع کرے اور دین کے بنیادی عقائد اور تعلیمات کو بگاڑنے کا سبب ہو، یا ارکان اسلام میں کمی یا زیادتی کرے، ختم نبوت کا انکار کرے، قرآن میں تحریف کرے، جہاد کو منسوخ کرے، سود کو جائز قرار دینے کے لیے کوئی عقیدہ گھڑ لے تو ان فتنوں کو قیامت تک کے لیے دین میں بدعت ضلالۃ کہیں گے اور یہی وہ فتنے ہیں جن کے ماننے والوں اور عمل کرنے والوں کو جہنم کا ایندھن قرار دیا گیا ہے۔[62]

---

[61] وحیدالزمان، ہدیۃ المہدی: ۱۱۷

[62] طاہرالقادری، کتاب البدعۃ، رقم: ۱۳۸

قرونِ اولیٰ میں بدعته ضلالة کن اُمور کو کہا جاتا تھا

اسلامی تاریخ میں قرونِ اُولیٰ سے مراد اسلام کے وہ ابتدائی تین بہترین دور ہیں (یعنی صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ) جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"خيرُ النّاسِ قَرني، ثُمَّ الّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الّذِينَ يَلُونَهُمْ"[63]

ترجمہ: سب سے بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر اس کے بعد والا، پھر اس کے بعد والا۔

قُرونِ اولیٰ میں گستاخانِ رسول ﷺ، مخالفین صحابہ اور کفریہ عقائد کے حاملین کو بدعته ضلالة کا مرتکب کہا جاتا تھا۔ متعدد احادیث مبارکہ اس بات پر شاہد ہیں کہ دورِ نبوی ﷺ اور عہدِ صحابہ میں خیر کے کاموں کا آغاز کرنے والوں کو تحسین کی نظر سے دیکھا جاتا تھا[64]۔ بدعته ضلالة کے مرتکب مشہور طبقے یہ ہیں جیسے خوارج، مرجعہ، معتزلہ، جہمیہ، روافض و باطنیہ اور قدریہ وغیرہ۔ آیئے ان طبقوں کے کفریہ عقائد کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں جن کی وجہ سے انھیں بدعته ضلالة کا مرتکب کہا گیا۔

خوارج: ان کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، یہ وہ گروہ ہے جو گناہوں کی وجہ سے مسلمانوں کو کافر قرار دیتا ہے اور مسلمانوں کا قتل اور اُن کے مال کو لوٹ لینا جائز سمجھتے ہیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے خوارج اور شیعہ کو اسلام کی پہلی بدعت قرار دیا۔ ابن تیمیہؒ خوارج کے عقائد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مسلمانوں کا خون بہانا جائز سمجھا اور جن کی صفت حضور ﷺ نے یہ بیان کی تھی کہ وہ اہلِ اسلام سے لڑیں گے اور بت پرستوں سے صلح رکھیں گے۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور دیگر صحابہؓ کو بھی کافر کہا، حتیٰ کہ ایک خارجی نے حضرت علیؓ کو شہید کر دیا۔[65]

مرجعہ: مسلمانوں کا ایک ایسا فرقہ ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ایمان کا تعلق محض قول اور زبان سے ہے عمل کا اس میں دخل نہیں۔[66]

معتزلہ: معتزلہ فرقہ بنو اُمیہ کے دور میں واصل بن عطاء کے ذریعے وجود میں آیا، جو حضرت حسن بصریؒ (وفات 110 ہجری) کا شاگرد تھا۔ ایک علمی بحث کے دوران واصل نے کہا کہ کبیرہ گناہ کرنے والا نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ درمیانی درجے میں ہے۔ پھر وہ کھڑا ہوا اور مسجد میں ایک طرف الگ ہو کر حضرت حسن بصریؒ کے شاگردوں میں اس عقیدے کی تلقین بھی شروع کر دی۔ حضرت حسن بصریؒ نے کہا "اعتزل عنا واصل" یعنی واصل ہم سے الگ ہو گیا، اسی نسبت سے اس کے ماننے والوں کو معتزلہ کہا گیا۔[67] معتزلہ کا دوسرا بڑا عقیدہ یہ تھا کہ قرآن مخلوق ہے، جس نے طویل عرصہ تک امت میں شدید اختلاف اور مناظروں کو جنم دیا۔

---

63 بخاری، الصحیح، رقم: ۳۶۵۰ ::: مسلم، الصحیح، رقم: ۲۵۳۳

64 طاہرالقادری، کتاب البدعة، رقم: ۲۱۷

65 ابن تیمیہؒ، مجموع الفتاویٰ، ۱۲: ۴۷۰

66 طبری، تہذیب الآثار: ۶۹۵

67 ذہبی، سیراعلام النبلاء، ۵: ۴۶۴

جہمیہ: اس فرقے کا بانی ابو مہر جہم بن صفوان (وفات 128 ہجری) تھا۔ اس فرقے کا عقیدہ تھا کہ قرآن مخلوق ہے اور اُن کے نزدیک دنیا میں جو بھی واقعات ہوتے ہیں اس کا علم اللہ تعالیٰ کو اُن کے ظہور کے بعد ہوتا ہے۔ ایمان کے بارے میں اُن کے عقائد مرجعہ کے عقائد سے ملتے جلتے تھے۔[68]

روافض و باطنیہ: علامہ ابن جوزیؒ (وفات 597 ہجری) اپنی کتاب تلبیس ابلیس میں روافض کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جس طرح ابلیس نے خوارج کو گمراہ کیا حتیٰ کہ انہوں نے حضرت علیؓ سے جھگڑا شروع کر دیا اسی طرح اُس نے بعض دوسرے لوگوں کو حضرت علیؓ کی محبت میں غُلو (یعنی اصل درجے سے بڑھا کر غیر شرعی مقام دینا) کی وجہ سے راہ ہدایت سے دور کر دیا۔ چنانچہ یہ لوگ حب علیؓ میں حد سے بڑھ گئے اور اُن میں سے بعض لوگوں نے حضرت علیؓ کو الٰہ یعنی خدا اور بعض نے خیر من الانبیاء (یعنی انبیاء سے بہتر) اور بعض دوسروں نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو سب و شتم (یعنی گالیاں دینا) شروع کر دیں۔[69]

قدریہ: یہ لوگ تقدیر کے بارے میں جھگڑا کرتے تھے۔ تقدیر کو عربی میں قدر کہتے ہیں۔ تقدیر پر بحث کا آغاز صحابہ کے آخری دور میں ہوا اور پہلا شخص جس نے تقدیر پر بحث شروع کی وہ معبد الجہنی تھا۔ اُس کے نظریات کو قریش مکہ کے عقائد سے تقویت ملتی تھی جو اپنے شرک کو جواز فراہم کرنے کے لیے تقدیر کا سہارا لیتے تھے۔ ایسے لوگوں کے عقائد کو اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں بیان کرتے ہیں کہ یہ لوگ کہتے تھے کہ: اگر اللہ چاہتا تو ہم اُس کے سوا کسی بھی چیز کی پرستش نہ کرتے، نہ ہی ہم اور نہ ہی ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام قرار دیتے۔[70]

قرون اولیٰ میں نیکی اور بھلائی کے کاموں پر بدعته ضلالة کا اطلاق نہیں ہوتا تھا

قرون اولیٰ میں اجتہادی نوعیت کے نئے امور پر بدعته ضلالة (یعنی گمراہی) کا اطلاق نہیں ہوتا تھا بلکہ ایسے اجتہاد کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس حوالے سے جمع و تدوین قرآن کے لیے حضرت عمر فاروقؓ کا خلیفہ وقت سیدنا ابو بکر صدیقؓ سے بات کرنا، حضرت عمرؓ کا اپنے دور خلافت میں جماعت تراویح کا اہتمام کرنا، حضرت عثمان غنیؓ کا جمعہ کی نماز میں دوسری اذان کا اضافہ کرنا یہ وہ امور ہیں جو نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ میں موجودہ صورت میں رواج پذیر نہیں تھے لیکن چونکہ مبنی خیر و حکمت تھے لہذا صحابہ اور تابعین سے لے کر آج تک امت کے افراد ان پر عمل کرتے چلے آرہے ہیں اور ان امور حسنہ پر کسی نے بھی کبھی بدعته ضلالة یعنی گمراہی کا اطلاق نہیں کیا۔

بدعته ضلالة کا اطلاق صرف کفریہ عقائد پر ہوتا تھا اور اس سے مراد ایسے فتنے تھے جو دین کی بنیادی تعلیمات کو مسخ کر دیں یا ان

---

68 احمد بن حنبل، الرد على الزنادقة والجهمية، ۳۱۳:۵ ::: عبدالقاهر بغدادی، الفرق بين القرق:۲۰۲

69 علامه ابن جوزی، تلبيس ابليس:۹۷

70 ابن كثيرؒ، البداية والنهاية،۳۴:۹

کاانکار کردیں۔اس سے مراد فقط فتنہ ارتداد اور اس کی مختلف شکلیں ہیں جو حضور ﷺ کے وصال کے فورا بعد پیدا ہوئیں یا بعد میں پیدا ہوں گی۔آج بھی کسی معاملے میں بدعت ضلالة کا اطلاق کرنے کے لیے ارتداد ہی ایسا قاعدہ اور کُلیہ ہے جس پر کسی بھی کام کو پرکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ بدعت ضلالة میں شمار ہوتی ہے یا نہیں۔

اجتہاد کی ترغیب

اگر کسی مسئلے کا کوئی حل قرآن مجید اور سنت نبوی ﷺ دونوں سے نہ ملے تو اجتہاد کرنا نہ صرف جائز بلکہ حکم نبوی ﷺ ہے۔یہ حکم از خود نئے کام کو جو قرآن وسنت میں نہ تھا محض خیر اور دینی ضرورت اور مصلحت کی بنا پر نہ صرف جواز فراہم کر رہا ہے بلکہ خود اس عمل اجتہاد کو بھی سنت بنا رہا ہے۔

امام ابوداؤد (وفات 275 ہجری) اپنی سنن میں کتاب الأقضِية میں روایت کرتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجتے وقت حضور نبی اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا: "(اے معاذ!) جب تمہارے سامنے کوئی مسئلہ پیش کیا جائے گا تو کس طرح اس کا فیصلہ کروگے۔انہوں نے عرض کیا میں اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اس معاملے کو اللہ کی کتاب میں نہ پاؤ تو، اُس پر حضرت معاذؓ نے جواب دیا کہ پھر میں سنت رسول کے مطابق فیصلہ کروں گا، پھر حضور ﷺ نے فرمایا اگر تم اس معاملے کا حل سنت رسول اور کتاب اللہ میں بھی نہ پاؤ، تو انہوں نے عرض کیا کہ پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (اپنا دست شفقت) میرے سینے پر مارا اور فرمایا کہ تمام تعریفیں اُس خدا کی ہیں جس نے اپنے رسول ﷺ کے نمائندے کو ایسی توفیق بخشی جو اُس کے رسول کی رضا کا سبب ہے۔"[71]

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو کام قرآن وسنت میں نہ ہو اور وہ اجتہاد اور اچھی رائے کی بنیاد پر طے کیا جائے تو یہ نہ صرف مستحسن ہے بلکہ بارگاہ رسالت مآب ﷺ کا منظور شدہ طریقہ ہے۔یہی اصول بدعت حسنہ میں کارفرما ہے جو اس حدیث مبارکہ سے ثابت ہے۔ اجتہاد ہی وہ دائمی اصول ہے جو اس دین فطرت کی تعلیمات کو زمانوں اور معاشروں کے بدلتے ہوئے حالات اور زندگی کے نئے تقاضوں کی تکمیل کے لیے تسلسل دیتا ہے اور جمود پیدا نہیں ہونے پاتا۔اسی اصول کی وجہ سے اسلامی نظام حیات کی تازگی اور کشش ہمیشہ قائم اور برقرار رہتی ہے۔اگر ہر نئے کام کو تجزیہ کیے بغیر بدعت قرار دے کر گمراہی تصور کر لیا جائے تو ہمیشہ کے لیے دینی معاملات میں اجتہاد کا دروازہ بند ہو جاتا جس سے بدلتے ہوئے حالات میں اسلام کا قابل عمل ہونا بھی ناممکن ہو جاتا۔

نیکی اور بھلائی کے چھوٹے چھوٹے کاموں پر بدعت کا اطلاق کرنا بذات خود بدعت ضلالة ہے۔اسی طرح دین کے نیک کام، نفلی عبادات اور خیرات وصدقات یہ سب نہ دین کی ضروریات میں سے ہیں اور نہ ہی ضروریات دین میں اضافہ ہیں۔لہٰذا ایسے امور

[71] ابوداود، السنن، کتاب القضاء، باب اجتہاد الرائی فی القضاء، ۳:۳۰۳، رقم:۳۵۹۲

کو بدعت ضلالة یا گمراہی کہنا حکمت دین کے خلاف ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ اور خلفائے راشدین نے دین میں بدعت ضلالة صرف ارتداد، انکار زکوٰۃ اور دعویٰ نبوت کی سطح کے فتنوں کو کہا ہے اور اس کے علاوہ دیگر تمام کام جو مستحب و حسنات ہیں اور صالحات ہیں ان کی تحسین کی ہے۔

اگر ہر نیا کام جو عہد رسالت ﷺ اور عہد صحابہ میں نہ تھا صرف اپنے نئے ہونے کی وجہ سے بدعت اور گمراہی قرار پائے تو دین کی تعلیمات اور فقہ کا بیشتر حصہ گمراہی کے زمرے میں آجائے گا اور اجتہاد کی ساری صورتیں قیاس، استدلال وغیرہ ناجائز کہلائیں گی۔ اسی طرح سے دینی علوم مثلاً اصول تفسیر، اصول حدیث، اصول فقہ، اُن کی تدوین اور اُن کو سمجھنے کے لیے مختلف علوم جیسے صرف و نحو، منطق، فلسفہ وغیرہ جو فہم دین کے لیے ضروری ہیں، ان کا سیکھنا سکھانا بھی حرام قرار پائے گا۔ کیونکہ یہ سب علوم اپنی موجودہ شکل میں نہ عہد رسالت ﷺ میں موجود تھے اور نہ ہی عہد صحابہ کرام میں، اُنہیں تو بعد میں ضرورت کے پیش نظر مرتب کیا گیا۔

اگر ہر نیا کام بدعت اور گمراہی قرار پائے تو دینی مدرسوں کی تعلیم و تدریس اور اُن کے نصاب کا بیشتر حصہ بھی گمراہی قرار پائے گا کیونکہ موجودہ درس نظامی کا نصاب اور درس و تدریس نہ تو حضور ﷺ کے زمانہ اقدس میں تھا اور نہ ہی اس طرح کسی صحابی نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اُن کا طریقہ نہایت سادہ تھا اور حافظے نہایت قوی تھے، وہ قرآن اور حدیث کو سنتے تھے اور اُسے آگے روایت کرتے تھے۔ اسلام کے ساتھ یہ المیہ رہا ہے کہ گہرائی سے مطالعہ نہ کرنے والے چھوٹی چھوٹی باتوں کو کفر و ایمان کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور دین کی بنیادی روح اور حکمت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

جن امور کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں کتاب و سنت خاموش ہیں وہ جائز ہیں

انسانی زندگی میں ہزاروں اشیاء ایسی ہیں جن کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں کتاب و سنت خاموش ہے، اس لیے جب تک اُن کے منع ہونے کا شرعی حکم موجود نہ ہو وہ مباح اور جائز ہیں۔ علماء و محدثین کا اس اصول پر اتفاق ہے کہ حضور ﷺ کا کوئی کام کرنا اس کے جائز ہونے کی دلیل ہے جبکہ کسی کام کا نہ کرنا اس کے حرام ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اسی اصول کی بنا پر امت کے علماء نے اسلامی شریعت کا متفقہ اصول طے کیا ہے کہ اصلاً "ہر چیز جائز اور حلال ہے۔[72]

کسی کام کے جائز یا حرام ہونے کا اصولی ضابطہ یہ ہے کہ ہم اس کام کو جو عہد رسالت ﷺ اور عہد صحابہ میں نہ تھا اور بعد میں کسی ضرورت کے تحت وجود میں آیا، کو قرآن و سنت پر پیش کریں گے، اگر قرآن و سنت کا اس کے ساتھ کسی اعتبار سے بھی ٹکراؤ ثابت ہو جائے تو وہ بلاشبہ ناجائز حرام اور گمراہی تصور ہو گا، لیکن اگر اُس کا قرآن و سنت کے کسی بھی حکم کے ساتھ کوئی تضاد یا ٹکراؤ ثابت نہ ہو تو اسے گمراہی یا حرام تصور کرنا حکمت دین کے منافی اور اسلام کے متعین کردہ نظام حلال و حرام سے ہٹ کر چلنا اور حد سے تجاوز

---

[72] ابن حجر عسقلانیؒ، فتح الباری، ٦٥٦:٩ ::: سیوطیؒ، الاشباہ والنظائر، ٦٠:١

کرنے کے برابر ہو گا۔

اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ فلاں شخص نے مجھ سے قرض لیا ہے تو اب دعویٰ کرنے والا خود ہی گواہی پیش کرے گا اور ثابت کرے گا کہ فلاں میرا مقروض ہے اور مقروض سے یہ تقاضا نہیں کیا جائے کہ وہ اپنے مقروض نہ ہونے کا ثبوت پیش کرے۔ امام ابو بکر بیہقیؒ (وفات 458 ہجری) سنن الکبریٰ میں روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ: "گواہی مدعی پر اور قسم انکار کرنے والے پر ہے۔"[73]

اسی طرح اگر کسی نے کوئی نیک عمل کیا اور کسی دوسرے شخص نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ یہ میلاد منانا، نعت خوانی کے اجتماعات منعقد کرنا، تلاوت قرآن کا ایصال ثواب کرنا، ذکر و درود کے اجتماعات منعقد کرنا وغیرہ یہ سب کام بدعت ضلالۃ ہیں اور حرام ہیں تو اب آپ کو ان اعمال کے حلال اور جائز ہونے پر دلائل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اُس اعتراض کرنے والے سے آپ کہیں گے کہ وہ اُوپر روایت کی گئی حدیث کے تحت اپنے دعوے کے ثبوت میں اس عمل کے حرام اور ناجائز ہونے پر گواہی لائے کیونکہ اصلا کوئی چیز حرام نہیں ہوتی بلکہ مباح ہوتی ہے، جب تک کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ اس کو حرام قرار نہ دے دیں۔ مذکورہ شخص نے چونکہ اس چیز کے ناجائز اور حرام ہونے کا دعوی کیا ہے لہذا اسے دلیل لانا پڑے گی کہ یہ چیز حرام کس بنیاد پر ہے۔ اگر وہ کہے کہ اس کا کہیں قرآن و حدیث میں ذکر نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس عمل کا کتاب و سنت میں ذکر نہ ہو وہ حلال اور مباح ہوتا ہے یعنی جن اعمال کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں کتاب و سنت خاموش ہوں وہ حلال اور مباح ہوتے ہیں۔

اللہ تعالی اپنے بندوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا چاہتا ہے اسی لیے اس نے صرف حرام اور ممنوع اشیاء اور کاموں کی فہرست بیان فرمائی ہے جو کہ محدود ہیں اور باقی سب کچھ جائز اور مباح کے طور پر ذکر کیے بغیر چھوڑ دیا ہے۔ اس بات کو ہم اس واقعہ سے سمجھیں گے کہ جب اللہ تعالی نے حج کے احکامات نازل کرتے ہوئے فرمایا:

"اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج فرض ہے جو بھی اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو"[74]

اُس پر ایک صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا ہر سال حج فرض ہے۔ حضور ﷺ نے چہرہ مبارک دوسری طرف پھیر لیا اور خاموش رہے، صحابی نے پھر پوچھا حضور ﷺ پھر خاموش رہے، اس نے تیسری مرتبہ بھی جب یہی سوال دہرایا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: اگر میں ہاں کہہ دیتا تو حج ہر سال فرض ہو جاتا اور تم اس کی استطاعت نہ رکھتے، جن چیزوں کا بیان چھوڑ دیا کروں تم ان کا سوال مت کیا کرو۔[75]

---

[73] بخاری، الصحیح، کتاب الشهادات، باب البينة على المدعى، ۹۳۱:۲ ::: بیهقی، السنن الکبریٰ، ۱۲۳:۸

[74] القرآن، آل عمران، ۹۷:۳

[75] مسلم، الصحیح، ۹۷۵:۲، کتاب الحج، باب فرض الحج مرة فی العمر، رقم:۱۳۳۷

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (وفات 55 ہجری) سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بے شک مسلمانوں میں سب سے بڑا جرم اُس مسلمان کا ہے جو ایسی چیز کے بارے میں سوال کرے جو کہ مسلمانوں پر حرام نہ تھی مگر اس کے سوال کرنے کی وجہ سے حرام کر دی گئی۔[76]

دین کے اس بنیادی فلسفے اور حلال و حرام کے اصول کو سمجھنے کے بعد اب بدعت کے تصور کو سمجھنا ہمارے لیے قدرے آسان ہو جائے گا کہ ہر وہ نیا کام جس کے بارے میں کتاب و سنت خاموش ہو وہ ہمارے لیے جائز اور مباح ہے تاوقتیکہ اس کام کے حرام ہونے کا ذکر قرآن و سنت یا پھر صحابہ سے ثابت ہو جائے۔

کسی بھی کام کا پرانا یا نیا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اس کا معنی تب متعین ہوتا ہے جب وہ کام کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے، جو چیز قرآن و سنت اور اجماع صحابہ کی مخالف ہو تو ایسی چیز بہر حال ناجائز اور مردود ہو گی چاہے اسے کرنے والے کوئی بڑے معتبر افراد ہی کیوں نہ ہوں، اور اگر کوئی کام قرآن و سنت اور اجماع صحابہ کی مخالف نہیں ہے اور اس کو ناجائز قرار نہیں دیا گیا تو وہ عمل جائز ہو گا، اس لیے کہ کسی چیز یا عمل کو حرام کرنے کا اختیار اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو ہی ہے کسی اور کو نہیں۔

حضور ﷺ اور صحابہ کرام کا کسی کام کو ترک کر دینا اس کے منع ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا ورنہ ہر وہ عمل جس کو خود اللہ تعالی نے قرآن میں بیان نہیں کیا اور اُس کا ذکر مناسب نہیں سمجھا وہ بھی حرام ہو جاتا۔ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ (وفات 852 ہجری) فتح الباری میں نقل کرتے ہیں کہ: کسی کام کا کرنا اس کے جواز (یعنی جائز ہونے) کی دلیل ہے اور نہ کرنا منع کی دلیل نہیں۔[77] حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے حرام چیزیں بیان کر دی ہیں اور جن چیزوں کے بارے میں خاموش ہے وہ جائز ہیں جیسا کہ قرآن پاک میں ذکر ہے کہ: اُس نے تمہارے لیے ان تمام چیزوں کو تفصیلا بیان کر دیا ہے جو اُس نے تم پر حرام کی ہیں۔[78]

اس آیت سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ جن کا ذکر نہیں کیا گیا وہ حلال ہیں کیونکہ ذکر نہ کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ مباح، جائز اور حلال ہیں۔ شریعت اگر اس چیز کا نام ہو کہ جسے خُدا اور اس کے رسول ﷺ نے جائز اور حلال فرمایا ہے اس کو جائز اور جس پر شریعت خاموش ہے اس کو ناجائز اور حرام ٹھہرا لیا جائے تو پھر روزمرہ زندگی میں صبح شام ہزاروں کام ایسے ہیں جن کا حکم نہ اللہ نے دیا ہے اور نہ حضور ﷺ نے اُن کے متعلق بظاہر کچھ فرمایا ہے، مثلا ہمارے کھانے پینے، اوڑھنے اور بچھونے کی اشیاء غرض یہ کہ ہمارا ہر لمحہ ایسی چیزوں سے وابستہ ہے جو عہد نبوی اور دور صحابہ میں موجود نہیں تھیں تو وہ بھی حرام ٹھہریں گی۔ اس حوالے سے چند احادیث ملاحظہ کریں۔ حضرت ابو ثعلبہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ:

---

[76] بخاری، الصحیح، ۲۶۵۸:۶، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، باب مایکره من کثره، رقم:۶۸۵۹ ::: مسلم، الصحیح، ۱۸۳۱:۴، کتاب الفضائل، رقم:۲۳۵۸

[77] ابن حجر عسقلانیؒ، فتح الباری، ۱۵۵:۱۰

[78] القرآن، الانعام، ۱۱۹:۶

بے شک اللہ تعالی نے کچھ باتیں فرض کی ہیں انہیں ہاتھ سے نہ جانے دو اور کچھ حرام فرمائی ہیں ان کی حرمت نہ توڑو اور کچھ حدیں باندھی ہیں آگے نہ بڑھو، اور کچھ چیزوں سے بغیر بھُولے خاموشی فرمائی ہے اُن کی کھوج نہ لگاؤ۔[79]

ان شرعی قوانین وضوابط کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر ہم بریلوی حضرات کے اُن اعمال کا جائزہ لیتے ہیں کہ جو ضروریات دین میں سے نہیں ہیں جیسے شب رات (۱۵ شعبان) اور شب معراج کی عبادت، نفلی روزوں اور میلاد النبی ﷺ پر خوشی منانا وغیرہ۔ یہ وہ اعمال ہیں جنھیں کچھ لوگ بدعت ضلالة قرار دیتے ہیں جو کہ ایک انتہائی قدم ہے۔ نبی کریم ﷺ کی میزبانی کا شرف ملنے پر تو انصار مدینہ نے بھی ہجرت کے موقع پر خوشی منائی تھی۔ لہٰذا اگر مولود النبی ﷺ کے موقع پر خوشی منائی جاتی ہے تو اُنھیں گناہگار اور بدعتی قرار دینا ایک غیر شرعی قدم ہی تصور ہوگا۔ ورنہ ان اعمال کی ممانعت پر قرآن وسنت سے سند لانا پڑے گی اور اس کو ثابت کرنے کی ذمہ داری اُنھیں پر ہے جنھیں ان اعمال پر اعتراض ہے۔ کیونکہ جن امور پر پر قرآن وسنت خاموش ہیں وہ اعمال جائز اور مباح ہیں۔

ان آیات اور احادیث کی روشنی میں شریعت کا یہ اصول اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ تمام اشیاء اصل میں جائز ہیں، جن اشیاء کو شریعت نے حلال قرار دیا وہ حلال ہیں اور جنہیں حرام قرار دیا وہ حرام ہیں اور جن اشیاء کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی اور اُن کے بارے میں کوئی بھی حکم حلال اور حرام کا نہیں دیا گیا وہ مباح اور جائز ہیں۔ کسی چیز کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے اُسے ناجائز یا حرام تصور کرنا شریعت کے خلاف ہے اور اسلام کے متعین کردہ نظام حلت وحرمت (یعنی کسی چیز کا حلال اور حرام ہونا) سے انحراف کے مترادف ہے۔

[79] بیہقی، السنن الکبریٰ، ۱۲:۱۰ ::: دارقطنی، السنن، ۱۸۴:۴، رقم: ۴۲ ::: طبری، جامع البیان، ۸۵:۷